نچولیا

منان احمد

"مشرقی رومانوی داستانوں کے لئے سیٹھ ناومل کی تاریخ وافر مواد فراہم کر سکتی تھی۔ اُس کے والد کو زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا اور بیٹا انگریزوں کو مدد فراہم کرنے کے موقع کی تلاش میں تھا تاکہ ظالم مسلمانوں سے ہندوؤں پر کئے گئے مظالم کا بدلہ لے سکے۔ ۱"

"ہندو کی بس ایک خصوصیت: منھ پر رام رام، بغل میں چھری۔" اُس وقت میری اُردو محاورتاً غیر معیاری تھی۔ میں حال ہی میں دوہا، قطر سے جنرل ضیاء الحق کے لاہور میں منتقل ہوا تھا۔ اس دور کی ۹ویں جماعت کی سماجیات کی نصابی کتاب میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ اُستادِ محترم نے اس سطر کو طنزیہ لہجے میں پڑھا تھا۔ اُن کے اندازِ گفتگو اور نتیجتاً کلاس میں چہچہاہٹ کی ترنگ سے میں اندازہ لگالیا تھا کہ کوئی استہزائیہ تبصرہ تھا۔ لیکن میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا: تصور کیجئے کہ اگر کسی کے پہلو میں خنجر گھونپ دیا جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ میں درد سے بلبلا اُٹھا۔ کتنے شرم کی بات تھی۔ گھر پہنچ کر والدہ سے پوچھا۔ انھوں نے وضاحت فرمائی: "بغل میں چھری" کا مطلب اصلاً بغل میں چھری نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے آستین میں چھپایا ہوا خنجر۔ "منھ پر رام رام" کا مطلب مقدس دُعا نہیں ہے {جیسا کہ میرے داد جان کا وظیفہ "یا رحمن، یا رحیم"}۔ اس کا مطلب ہے ریاکاری۔ "ہندوؤں کی ایک ہی خصوصیت ہے: وہ اپنی آستین میں خنجر چھپائے رکھتا ہے اور جیسے ہی موقع ملتا ہے وار کر دیتا ہے، حالانکہ اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر رام رام کا جپ ہوتا ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ میں کسی ہندو سے گفتگو کر کے اس خیال کی تصدیق یا تردید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ۱۹۸۰ء کے وسط کے لاہور کے پاس اس کے ہندو ماضی کے اِکا دُکا اور مبہم آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔۔۔ کسی مقام کا نام، جھاڑیوں سے ڈھکی چھپی کسی عمارت کے متعلق چند افسانے، افق کی آغوش میں مدفون کوئی مرغولہ دار صورت۔۔۔ مادھو لال یا چندر بھان کا شہر تو لوگوں کی یادوں تک سے محو ہو چکا تھا۔ والدہ سے دریافت کیا تو انھوں نے مجھے دوہا میں میری حساب کی اُستانی کی یاد دلائی جو ایک تمل خاتون تھیں اور بلا شبہ ایک ہندو تھیں۔ کیا مجھے کبھی محسوس ہوا کہ وہ میرے پہلو میں خنجر گھونپ سکتی تھیں؟

بالکل نہیں۔

میرے اُستادِ محترم کو تاریخ سے بڑی جوشیلی عقیدت تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جب ان سے دریافت کیا: "جناب ہندوؤں پر کیوں کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئیے؟" تو وہ فوراً جوش میں آگئے۔

کیونکہ وہ تمھیں ضرور دغا دیں گے۔ جیسا کہ نوآبادیاتی دور میں بار بار انھوں نے مسلمانوں کو دغا دی تھی۔ کلاس: "دو قومی نظریہ کیا ہے؟" ہندو اور مسلم دو مختلف تہذیبیں ہیں جن کے درمیان، صدیوں سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود، کبھی ثقافتی، مذہبی یا اقتصادی اختلاط نہیں

پیدا ہو سکا۔ ہندوؤں نے اکثر برطانوی قوتوں کے ساتھ مل کر مسلم اقلیتوں پر مظالم ڈھائے۔ ہمارے رہنماؤں، مثلاً قائدِ اعظم محمد علی جناح اور علاّمہ محمد اقبال نے اِس ملک کو مسلمانوں کی جائے پناہ کے طور پر تخلیق کیا۔ میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ انگریزوں نے پورے ہندستان کو فتح کر لیا تھا، لیکن پاکستان ناقابلِ تسخیر تھا۔۔۔ پلاسی کی جنگ کے سو سال کے بعد بھی سندھ، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، اور بلوچستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد تھے۔ پہلا صوبہ جس نے اپنی آزادی کھوئی سندھ تھا۔ انگریزوں نے اس کو ۱۸۴۳ء میں فتح کیا۔ یہ تب ہوا جب ایک ہندو غدّار سیٹھ ناومل ہاٹچند نے اپنے تالپور کے مالکوں کو دغا دے کر ان کی رعایا کو انگریزوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ جلد ہی انھوں نے پنجاب پر اور پھر تمام جگھوں پر قبضہ جما لیا۔ ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئیے {مجھے یاد ہے کہ اُن کی آواز میں ڈرامائی طور پر بلند آہنگی پیدا ہو گئی تھی} کہ ہندوؤں نے عزّتیں لوٹی تھیں اور قتل و غارت گری مچائی تھی {انھوں نے "عزّتیں لوٹی تھیں" کہا تو کلاس میں دوبارہ ہلچل کی ایک ترنگ پھیل گئی}

میں خاموش رہا۔

بہت سالوں بعد میں کتب خانوں اور دفاتر میں مسلمانوں کی ۸ ویں اور ۹ ویں صدی میں الہند والسندھ {برِّصغیر ہند کے لئے عرب جغرافیہ دانوں کی اصطلاح} کی فوجی مہمات سے متعلق مسوّدات کی تحقیق کر رہا تھا۔ میں اکثر کسی خاص مسوّدے کی تلاش میں حیدرآباد {سندھ} کے گرد آلود کتب خانوں اور دفاتر سے نکل کر ردّی کی دکانوں کے چکر لگایا کرتا {حالانکہ نایاب مسوّدں کے حصول کی امید دونوں مقامات پر مایوس کن حد تک یکساں تھی}۔ یہاں ایک بار پھر میرا تعارف غدّار سیٹھ سے ہوا۔ سندھی قوم پرستوں سے۔۔۔ جن کا خیال تھا کہ سندھ کے علاقے کا سیاسی وجود قیام پاکستان سے قبل تھا، لہذا اسے پاکستانی قومی نظرئیے کے زُمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔۔۔ گفتگو کے دوران میں نے سیٹھ ناومل ہاٹچند کا ذکر سنا۔ اُن کا پرزور دعویٰ تھا کہ سیٹھ ناومل ایک غدّار تھا جس نے انگریزوں سے مل کر سندھ کے اصلی حکمرانوں یعنی تالپور کے میروں کو دغا دی تھی۔ اس کی یادیں داغدار ہیں۔ اس کا نام باعث شرم ہے۔

یہ رنجیدہ مجاہدینِ آزادی، غدّاری کا الزام سیٹھ کے ہندوپن پر نہیں، بلکہ ایک سیاسی حکومت سے اُس کی عدم وفاداری کے کندھوں پر ڈال رہے تھے۔ میں اس معاملے کی مزید چھان بین کرنا چاہتا تھا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا تھا کہ بلوچی تالپور نسلی اعتبار سے خود غیر سندھی تھے۔ یا یہ کہ خواہ یہ بات کتنی ہی متنازعہ فیہ کیوں نہ ہو، سندھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ناگزیر تھا، کیونکہ انگریزوں کو دریائے سندھ کی ضرورت تھی تاکہ

وہ چینی بندرگاہوں کو افیم برآمد کر سکیں ۔ مزید برآں ان کو افغانستان کی مہمات میں رسد کی فراہمی کے لئے ایک راستے کی ضرورت تھی۔

میں خاموش رہا۔

سندھ کے دو اہم مورّخین، حمیدہ کھوڑو اور مبارک علی، نے ہاٹچند کے مختصر جائزے پیش کئے ہیں۔ کھوڑو کے مطابق ہاٹچند ایک "موقع پرست" شخص تھا اور وطن پرستی کے اصولوں کے مدِّنظر اسے ہمیشہ ایک بے شرم غدّار" سمجھا جائے گا۔ مبارک علی نے زیادہ فراخدلی سے کام لے کر اس کے کردار کو مختلف ردّعملوں میں سے ایک مخصوص ردِّعمل کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ آخر موجودہ تاریخ نویسی میں قوم پرستی اور نوآبادیات کے درمیان پیش کئے گئے بے لچک دوگانوں کے اندر امکانات کی گنجائش ہی کہاں ہے: آپ احتجاج کر سکتے ہیں یا موت کو گلے لگا سکتے ہیں؛ آپ ہیرو ہوسکتے یا غدّار۔ اس صورتِ حال میں دلالوں، ترجمانوں، مترجمین اور بچولیوں کا باہم مربوط نظام عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔

لیکن ایسے دوگان تاریخی الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ ہاٹچند فارسی اور انگریزی بولنے والے معلومات کے دلالوں { ہندو اور مسلمان دونوں } کے اس وسیع رابطے کے نظام کا محض ایک رُکن تھا جو نوآبادیاتی اور ریاستی رابطوں کے نظام کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ خطیبوں ، منشیوں، عاملوں اور وکیلوں پر مشتمل بچولیوں کی عموماً نظر نہ آنے والی یہ دنیا ہی روزمرہ کی حکومت کے سفارتی اور قانونی امور کو ممکن بناتی تھی ۔ ہاٹچند اُن بہت سے افراد میں سے ایک تھا جنھیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی خدمات کے سلسلے میں کافی سراہا تھا: مرزا علی اکبر اُس جنرل چارلس نیپئر، کے ملازم تھے ، جس نے سندھ پر قبضہ کیا تھا۔ انھیں مترجم اور ترجمان کی حیثیت سے کمپنی کی خدمات کے لئے کئی خطابات اور تمغوں سے نوازا گیا تھا۔ اسی طرح سیاسی ایجنٹ میجر ایسٹ وک کے ملازم مرزا لطف اللہ نے سندھ سے ہونے والے اہم معاہدوں میں کمپنی کی طرف سے گفت و شنید کی تھی۔ ان میں سے کچھ تو اپنی تحریروں اور یادداشتوں میں اور کچھ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے رجسٹروں میں محض ناموں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ لیکن ان تمام ہم پیشوں میں صرف ہاٹچند کے نام کو موجودہ پاکستان میں ایک "غدار" کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

۱۹۷۱ء کے بعد سے پاکستان میں قومی شناخت کی تشکیل کا انحصار مکمل طور پر جنوبی ایشیا کی تاریخوں کی فرقہ وارانہ تعبیر پر رہا ہے، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو لاممکن مقولات کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ اس طرح کی بریدہ بیانی قوم پرستانہ مباحث کو تو آگے بڑھا سکتی ہے لیکن یہ تاریخ کی عکاسی نہیں کرتی ۔ یہاں میرا ارادہ ہے کہ میں سیٹھ ناومل ہاٹچند کی کہانی کو حکمراں قوتوں کے ایک بچولیے کی کہانی کے طور پر پیش کروں، جو بین الاقوامی سطح پر

تشکیل دی گئی سیاست میں ایک مقامی بچولیا تھا، اور جو غدّار اور دشمنوں کے معاوِن کی علامت ہونے کے بجائے ایک ایسی حالتِ نسیاں کی علامت تھا جو جدید قومی ریاستوں کو ایسا اپاہج بنا دیتی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے ماضی کو بھول جاتی ہیں اور اس خلا کو پر کرنے کے لئے اتنی ہی آسانی سے ایک نیا ماضی اِختراع کر لیتی ہیں۔

ایک مشرقی رومانوی داستان

"مشرق" ایک افسانہ بھی ہے اور ایک رومانوی داستان بھی۔ اس مضمون کے آغاز میں پیش کئے گئے حوالے میں برطانوی افسر کے ذریعے گڑھا گیا افسانہ ہماری نوآبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی کہانیوں کو ایک چوکھٹا فراہم کرتا ہے ۔۔۔ ایک ہندو فرزند کا اپنے باپ پر کئے گئے مسلمانوں کے مظالم کا انتقام۔ یہ رومانوی داستان مابعد نوآبادیاتی پاکستان میں اپنے محور پر گھوم کر ایک نیا افسانہ تخلیق کرتی ہے ۔۔۔ سبھی ہندو غدّار ہیں اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا ایک ساہوکار سیٹھ ناومل ہاٹچند اس کی نمائندہ مثال ہے، جس کی غدّاری ایک ریاست کی شکست کا سبب بنی۔

سیٹھ ناومل ہاٹچند سی ایس آئی {۱۸۷۸-۱۸۰۴} نے "کراچی کے سیٹھ ناومل ہاٹچند کی یادداشت" کے عنوان سے ۱۸۷۲ء میں اپنے پوتے سے اپنی یاداشت رقم کروائی ۔ ۱۹۱۵ء میں اِس کا سندھی سے انگریزی زبان میں ترجمہ شائع ہوا۔ لیکن اس کی اشاعت کے وقت اس کے مدیر سر ایون ایم جیمس نے ایک عجیب شرط لگا دی تھی کہ یہ اشاعت "سیٹھ ناومل کے وارثوں، رشتے داروں، سندھ سے متعلقہ افسروں اور ان کے ذاتی دوستوں تک محدود رہنی چاہئیے۔" یہ دستاویز جسے ابتدا میں چند لوگوں تک ہی محدود رہنا تھا، اب جنوبی ایشیا کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کے حامل واقعات کے سلسلوں ۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ ۔۔۔ کے مطالعے کے لئے ہمارے بنیادی ماخذوں میں سے ایک ہے۔ یادداشت سیٹھ ہاٹچند کے خاندان کے سندھ میں آباد ہونے، یہاں کے حکمرانوں سے دلالوں اور ساہوکاروں کی حیثیت سے منسلک ہونے، ۱۸۳۲ء میں ہاٹچند کا ایسٹ انڈیا کمپنی سے رشتہ قائم ہونے، ۴۱-۱۸۳۸ کی افغان جنگوں میں اس کے ملوث ہونے، ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کا قبضہ اور ۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخ کے واقعات پر مبنی ہے۔ ان سارے تاریخی واقعات کے دوران اس نے اپنی سرگرمیوں، مثلاً افغانستان سے ایران اور اس سے بھی آگے اشیائے ضروری یا تجارتی اشیا یا معلومات کی فراہمی اور جاسوسی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ سندھ کے سب سے کامیاب تجارتی خاندانوں میں سے ایک خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے معلومات کے دلالوں کے طبقے کے ذاتی اور خاندانی رابطوں کے نظام تک اس کی براہِ راست

رسائی تھی ۔ یہ لوگ مختلف درباروں میں منشی، ساہوکار، وکیل اور منیم کی حیثیت سے کام کرتے تھے ۔ یہ رابطے کا ایک ایسا نظام تھا جس کے ذریعے معلومات اور اشیا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی تھیں ۔ حکمراں میروں اور پنجاب، کلات اور افغانستان کی ریاستوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے انگریز حکومت ہاٹچند اور اس کے روابط پر منحصر تھی ۔ ۱۸۶۷ء میں اُسے ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران انگریزوں کی خدمات کے لئے "کمپینین آف دی اسٹار آف انڈیا" { سی ۔ ایس ۔ آئی } سے نوازا گیا ۔

ہاٹچند "درمیانہ قد ، ذہین آنکھوں والا ایک کفایت شعار شخص تھا ۔" اس کے آبا و اجداد مالی امور سے متعلق اُس متحرک اور توانا روابط کے نظام کا حصہ تھے جو بحرِ عرب کی بندرگاہوں کو مربوط کرتا تھا اور جو پورے برّ صغیر میں پھیلا ہوا تھا ۔ وہ ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں کراچی کی دیہی بندرگاہ میں اُس زمانے میں آکر آباد ہوئے تھے جب کراچی کلات کے خان کے ہاتھوں سے نکل کر تالپور کے میروں کے ہاتھوں میں پہنچنے والا تھا ۔ "یادداشت" کے مطابق خون خرابے کے بغیر انتقالِ اختیارات میں اُس کے آباو اجداد کے اہم رول کی وجہ سے بہت جلد اُن کی رسائی نئے صاحب اختیار میروں تک ہوگئی تھی ۔ ہاٹچند کے خاندان کو انعام میں زمینیں اور جاگیریں اور بہت سی خصوصی تجارتی مراعات عطا کی گئیں ۔ ان کی خاص حیثیت کا اندازہ ہاٹچند کے کراچی کے آبائی مکان کے بیان سے بھی ہوتا ہے ، جس کے اصطبل میں بیک وقت چالیس گھوڑے رہ سکتے تھے اور خاندان کے اخراجات چالیس ہزار روپئے سالانہ تھے اور خاندان کا کاروبار تقریباً ۵۰۰ مقامات پر چلتا تھا ۔ اپنے خاندان کی حیثیت اور ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں سندھ میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ایک دل چھو لینے والے بیان میں ہاٹچند ۱۸۱۲ء کے ایک تباہ کن قحط کا ذکر کرتا ہے، جس نے علاقے کے اناجوں کا صفایا کر دیا تھا اور جس سے امیر اور غریب دونوں کو بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔

" میرے بزرگوں سیٹھ دھنا مل اور سیٹھ لال من داس کے پاس اناجوں سے بھرے گودام تھے ۔ انھوں نے سوچا کہ لوگوں کی مدد کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا اور انھوں نے لوگوں کو بلا تفریق ذات پات اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان ، مفت اناج تقسیم کرنا شروع کر دیا ۔ ۔ ۔ اور جب سیٹھوں کو بتایا گیا کہ کچھ شریف خاندان دن کے اُجالے میں، بلکہ رات کی روشنی میں بھی ، سیٹھ کی خیرات لینے میں شرم محسوس کرتے تھے ، تو انھوں نے روشنی گل کروا دی اور محض آواز کی پکار پر اناج تقسیم کئے ۔ ۲ "

حالانکہ اس کہانی سے ہاٹچند کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس کے بزرگ سندھ کے عوام کے لئے کیسے فیاض تھے ۔ لیکن اس بیان سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس زمانے میں ثقافتی اور معاشی ڈھانچوں میں ایسی لچک موجود تھی جو ایک امیر ہندو کا گودام اناجوں سے بھر سکتی تھی

جبکہ شریف مسلمان خاندان بھی اناج کے لئے دوسروں کے سامنے دامن پھیلانے پر مجبور تھے۔

۱۸۲۱ء میں ہاٹچند کے پردادا سیٹھ بھوجومل کی موت کے بعد جائداد اور کاروبار کو چار بھائیوں میں مساوی طور پر تقسیم کردیا گیا۔ صرف ہاٹچند کے دادا لال من داس نے کاروبار میں دلچسپی لی۔ باقی بھائی کاروبار کو ایجنٹوں کے ہاتھوں میں چھوڑ عیش ونشاط میں ڈوب گئے۔" اس طرح اپنی دولت لٹا کر انھوں نے لال من داس کی جائداد پر اپنا دعویٰ پیش کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لال من داس نے سونے چاندی سے بھری تین ہانڈیاں تقسیم کئے بغیر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ آخر کار یہ تنازعہ شاہی میروں کے دربار میں پہنچا۔ سیٹھ لال من داس اور ان کا کارواں چھ اونٹوں پر لدے دفاتر {بہی کھاتوں} کے ساتھ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوا۔" چھ مہینے بعد فیصلہ سیٹھ لال من داس کے خلاف ہوا۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مسکٹ کے کاروبار میں اپنے بھائیوں اور ان کی اولادوں کو حصہ دیں۔ لیکن بھائیوں کی اولادیں فیصلے سے مطمئن نہیں ہوئیں۔ انھوں نے میر مراد علی کے دربار میں ایک اور اپیل کی اور رومی بندوقیں اور دوسرے قیمتی تحائف دے کر مراد علی کی خوشنودی حاصل کرلی۔" یہ نیا تنازعہ اور میر مراد علی کی ثالثی کا سلسلہ اگلے کئی سالوں تک چلا۔ اس سلسلے میں ہاٹچند اور اس کے بوڑھے دادا کو کئی بار چھ چھ مہینوں کے لئے حیدرآباد میں رہنا پڑا۔ ۱۸۲۷ء میں بھائیوں کی اولادوں نے تجویز پیش کی کہ اگر انھیں ۴۲،۵۰۰ روپئے کی ایک مشت رقم دے دی جائے تو وہ اپنے دعوے سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہوجائیں گے۔ ہاٹچند یہ تنازعہ ختم کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے اپنی دستخطِ خاص سے یہ رقم دینی منظور کرلی۔ اس سودے میں وہ بڑے پیمانے پر مقروض ہوگیا۔ حالانکہ ہاٹچند کہتا ہے کہ مقدمہ بالکل بے بنیاد تھا، اور اس کی وجہ سے اس کے دادا کو بہت تکلیفیں جھیلنی پڑیں، لیکن اس نے اپنے خاندان کے خلاف میروں کے متعصبانہ روّیے کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ مگر ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تخیل پر کوئی زور ڈالنے کی ضرورت نہیں کہ اب میروں سے ہاٹچند کا موہ بھنگ ہوچکا تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد، ۱۸۳۲ء میں، ایک رنجیدہ ہندو لڑکے نے اپنے والدین سے بھاگ کر نصرپور کی مسجد میں پناہ لی۔ اس چھوٹے سے واقعے نے ایک مذہبی طوفان کی شکل اختیار کرلی، جس نے نشیبی سندھ کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاٹچند کے والد کو اغوا کرکے مطالبہ کیا گیا کہ یا تو وہ تاوان دیں یا اسلام قبول کریں۔ اگرچہ دس دن کی قید کے بعد بالآخر انھیں چھوڑ دیا گیا، لیکن کسی طرح افواہ پھیل گئی کہ انھیں زبردستی مسلمان بنایا گیا ہے۔ حالانکہ نوآبادیاتی تبصرہ نگار اور پاکستانی قوم پرست تجزیہ نگار اس واقعے کو ہاٹچند کی تبدیلی وفاداری کے محرّک کے طور پر دیکھتے ہیں، لیکن ہاٹچند کی یادداشت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہاٹچند نے تبدیلی مذہب کے معاملے پر براہِ راست کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن

وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ قید سے چھوٹنے کے بعد اس کے والد نے کئی مندروں کی زیارت کی۔ اور وہ یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ تالپور کے میروں نے اس کے والد کو قید سے آزاد کرانے کے لئے زیادہ کوشش نہیں کی۔

ہاٹچند کے والد کے اغوا اور ہاٹچند کے ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعاون میں براہِ راست تعلق کا علم ہمیں خود کمپنی کے رکارڈوں سے ہوتا ہے جن میں قصداً یہ بیان کیا گیا ہے کہ سندھ کے مسلم حکمرانوں اور ہندو عوام کے درمیان سخت اختلاف تھا اور اس کا سبب مکمل طور پر تالپور کے میر تھے۔ حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ کمپنی کے افسروں مثلاً جیمس برنیز، رچرڈ برٹن، جیمس ایوانس، یا بدنامِ زمانہ چارلس نیپیر کی رپورٹیں، جن میں تالپور کے میروں کی "خبیث" حرکتوں کا ذکر ہے، دراصل میروں کی حکومت کے سیاسی جواز کو ختم کرنے اور سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے حق میں غیر دیانتدارانہ جواز تھیں۔ مگر حتمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ ہاٹچند نے انگریز افسروں کی خواہ کسی طرح کی مدد کیوں نہ کی ہو، لیکن وہ سندھ کے قبضے کے ناگزیر سیلاب کا نہ تو سبب تھا اور نہ اس کی وجہ سے سیلاب کی رفتار میں کوئی تیزی پیدا ہوئی۔

۱۸۳۰ء سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے وسط ایشیا میں اپنے اثرات بڑھانے، روسیوں اور فرانسیسیوں کو دور رکھنے اور امریکہ، چین اور برطانیہ کے درمیان افیم اور کپاس کی سہ رُخی تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ بالآخر مفروضہ روسی خطرہ پہلی اینگلو افغان جنگ {۱۸۳۸-۴۲} کا سبب بن گیا۔

استعماریت کے اپنے عظیم کھیل سے ہراساں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ کے میروں سے ۱۸۳۹ء میں ایک نیا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کی رو سے سندھ کے علاقے میں کچھ انگریز فوجی ٹکڑیاں تعینات کر دی گئیں، ریاست کے خارجی معاملات میں میروں کو انگریزوں کے حق میں دستبردار ہونا پڑا، میروں نے انگریزوں کو ایک متعینہ رقم سالانہ طور پر دینا منظور کر لیا، اور انگریزوں کو سندھ میں سکے ڈھالنے کا اختیار بھی حاصل ہو گیا۔ اسی دوران ایڈمرل میٹ لینڈ نے اس بہانے سے کہ کسی نے بندرگاہ کے اندر برطانوی بحری جہاز پر حملہ کیا تھا، کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ کراچی پر قبضہ میروں کے لئے ایک زبردست نقصان تھا کیونکہ یہ بہت اہم تجارتی بندرگاہ تھی۔ دراصل مالوہ اور بنگال سے چین کے لئے افیم کی برآمد پر کمپنی کو کنٹرول کی سخت ضرورت تھی تاکہ وہ محصول اور رسد کی فراہمی دونوں پر کنٹرول رکھ سکے۔ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل آف انڈیا، لارڈ ایلن برو نے سندھ پر قبضے کی منظوری کے لئے بالکل یہی مالی دعویٰ پیش کیا تھا۔ سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ناگزیر تھا۔

سیٹھ ناومل ہاٹچند کو غدّار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ایک ناگزیر عظیم تصادُم کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ وہ ایک سوداگر، تاجر، بچولیا اور "معلومات کے نظام" کا محض ایک جزو تھا۔ اگر چہ اس کی زندگی کے تانے بانے علاقائی اور نوآبادیاتی قوتوں کی باہمی کشا کش کے واقعات سے الجھے ہوئے ہیں، لیکن اس کو ان واقعات کے نتائج کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

لیکن ایک طرف ہاٹچند کی تو مذمت کی جاتی ہے اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام مسلمانوں کے غدّار کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ دوسری طرف مرزا علی اکبر کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ جہاں کراچی میں نیپئیر روڈ جیسی شاہراہ تعمیر کر کے چارلس نیپئیر کی عزت بڑھائی جاتی ہو، جہاں سیٹھ ہاٹچند روڈ کا نام شاہ ولی اللہ روڈ رکھ دیا جاتا ہو، جہاں ہندوؤں کا وجود محض ایک مضحکہ خیز عفریت کی طرح ہو، وہاں سیٹھ ناومل ہاٹچند کی شبیہ کو ایک غدّار کی شبیہ میں بدل دینا ایک دوہرا تشدّد ہے۔

۱۔ فریڈرک جے۔ گولڈ سمڈ، جیمس اوٹریم: اے بیو گرافی {لندن: اسمتھ ایلڈر، کمپنی۔، ۱۸۸۱}، ۴-۳۹۳

۲۔ کراچی کے سیٹھ ناومل ہاٹ چند سی ایس آئی کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہندوستانی تاریخ کا ایک فراموش کردہ باب،، ۱۸۰۴-۱۸۷۸، کراچی، 1982 {پہلا ایڈیشن، ایکسیٹر، 1915}، ۴۹،

مترجم: ڈاکٹر آفتاب احمد